وسطیہ : اسلام کا فلسفہ اعتدال

* پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز کو کسی نہ کسی مقصد اور حکمت کے تحت پیدا کیا۔ کائنات کی تمام مخلوقات میں سب سے نمایاں مقام انسان کو حاصل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل وفکر اور علم کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، ساتھ ہی یہ دُنیا اس کے لیے دارالامتحان بھی ہے۔ اس لیے کہ انسان اس دنیاء میں خیر وشر دونوں صلاحیتوں کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا ﴾ (الشمس: 91-817)

''اور قسم ہے انسانی جان کی اور اس ذات کی جس نے اسے درست اور معتدل اعضاء کے ساتھ بنایا، اور پھر خیر وشر دونوں کی سمجھ اور صلاحیت القاء کی۔''

ہر انسان نیکی اور بدی دونوں صلاحیتوں کے ساتھ دُنیا میں آتا ہے، لیکن طفولیت کے آغاز میں نیکی کا شعور غالب ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر بچہ کی پیدائش دین فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقع پر جو نفخ روح کا عمل ہوا تھا اس نے انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کو اپنے اندر اجاگر کر سکے، نفخ روح نے ہی ایک طرف علم وفکر کی بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت پیدا کی تو دوسری طرف روحانی و اخلاقی بلندیوں کے حصول کی صلاحیت بھی پیدا کر دی۔ اب اگر انسان کو سازگار اور تعمیری ماحول میسر ہو، تعلیم وتربیت کا بہتر انتظام ہو تو وہ انسانیت کے اعلیٰ مقام کو حاصل کر سکتا ہے اور اپنے علم وفکر اخلاقِ فاضلہ اور کردار سے معاشرہ اور گردوپیش کے ماحول پر بہت عمدہ، صحت مند اور تعمیری اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

سورۂ روم میں وارد آیت فطرت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی اصل خیر پر مبنی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس دین فطرت پر پیدا فرمایا جو سراسر خیر ہے:

﴿ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا. فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا. لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ. ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ (الروم: 3:30)۔

''پس اے محمد ﷺ یکسو ہو کر اپنا رخ دین حنیف (اسلام) کی طرف کر لیجئے، اللہ تعالیٰ کی اس فطرت پر ثابت قدم رہیے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی ہونی چاہیے، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔''

سابق ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

اس آیتِ مبارکہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیدائشی طور پر ہر انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اسے حق و باطل کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اگر انسان اسی فطرت سلیمہ پر قائم رہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے تو وہ ہمیشہ حق وصداقت کی طرف مائل رہے گا۔ اس بات کی وضاحت احادیث میں بھی ملتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه وينصّرانه كما تناتج الابل من بهيمة جمعا، هل تحس من جدعاء (سنن ابی داؤد حدیث نمبر 4714، صحیح بخاری، کتاب الجنائز حدیث نمبر 1292، صحیح مسلم، کتاب القدر، حدیث نمبر 48:3)

''ہر بچہ جو بطن مادر سے پیدا ہوتا ہے وہ اصل فطرت پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، (اس کی مثال ایسے ہے جیسے) جانور کے پیٹ سے مکمل صحیح وسالم بچہ پیدا ہوتا ہے، کوئی بچہ بھی کٹے ہوئے کان لے کر نہیں آتا۔''

حجاج بن منہال ''فطرۃ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے اس عہد کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ارواح آدم سے لیا تھا۔ الست بربکم کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تمام ارواح نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کیا۔ (دیکھیے ابو داؤد، سنن حدیث نمبر 4716) گویا ہر فرد عہد الست والی فطرت پر پیدا ہوتا ہے (1)۔

ان آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل فطرت تو اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی ربوبیت اور اس کے معبود ہونے کے اعتراف پر مبنی ہے، لیکن ولادت کے بعد انسانوں کا پیدا کردہ ماحول اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے کہ ماحول کا اثر نہ صرف انسان کے ظاہر پر ہوتا ہے بلکہ فکر اور کردار پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔ صحتمند جسمانی اور فکری ارتقاء کے لیے ہر فرد کو ایک بہتر صحت منداور صالح ماحول کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس ماحول میں اس کی ذہنی، فکری، ظاہری اور باطنی صلاحیتیں بہتر طور پر پروان چڑھ سکیں۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا محور بھی یہی رہا ہے کہ وہ تعلیم وتربیت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ انسانی معاشرہ کے لیے ایسا مضبوط اور موثر ماحول پیدا کرتے ہیں جس میں شر کی قوتیں تو سمٹ کر رہ جاتی ہیں اور خیر کی تمام قوتوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام انسانوں کی فطرت کی حفاظت اور ان میں اعتدال کو برقرار رکھنے کے لئے ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ خیر کی صلاحیتیں پھلیں پھولیں اور اس قدر توانا ہو جائیں کہ شر کی صلاحیت ان کے سامنے ماند پڑ جائے اور غیر موثر ہو جائے۔

اس قسم کے ماحول کی تشکیل کے لیے انبیاء علیہم السلام اپنے کام کا آغاز انسانوں کی فکری تطہیر اور اخلاقی تربیت سے کرتے

ہیں۔ جہاں تک فکری تطہیر کا تعلق ہے تو انبیاء انسانیت کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں، ایمان، اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین انبیاء علیہم السلام، جو وحی الٰہی کی عملی تشکیل کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، کی مکمل اطاعت اور آخرت میں اپنے تمام اعمال کے حساب و کتاب اور اعمال کی بنیاد پر آخرت میں جزا و سزا کے عقیدہ سے کرتے ہیں۔

عقیدہ توحید، اس کی وسعت و ہمہ گیری کا شعور، عقیدہ رسالت اور رسالت مآب سے ہمارے تعلق کا ادراک، اس کائنات کی حقیقت اور اس کائنات میں انسانی منصب و مقام کا فہم اور اسی اعتبار سے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا شعور انسانی فکر کو نہ صرف مستحکم کرتا ہے بلکہ کمال کی جانب ارتقائی مراحل طے کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

دوسرا اہم کام انسانی رویوں کی تعمیر و تہذیب کا ہے، انبیاء علیہم السلام دو پہلوؤں سے یہ فریضہ انجام دیتے ہیں، سب سے پہلے وہ انسانوں کے قلوب کے تزکیہ اور باطن کی تطہیر کا کام کرتے ہیں۔ تزکیہ نفس انبیاء علیہم السلام کے فرائض منصبی میں تلاوت وحی کے بعد سب سے مقدم کام ہے۔ تطہیر باطن کے لیے ضروری ہے کہ نفس انسانی میں اگر حرص و طمع، کذب و نفاق، حسد و تعصب، نفرت و عداوت، خیانت و بدگمانی، خود پرستی و شہوت پرستی کی آلودگیاں پائی جاتی ہوں تو جب تک باطن کو ان امراض اور آلودگیوں سے پاک صاف نہیں کیا جاتا اس وقت تک قلوب میں فضائل کو پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ انبیاء علیہم السلام ان تمام رذائل کو کھرچ کھرچ کر صاف کرتے ہیں اور پھر تعمیر انسانیت اور شخصیت سازی کا عمل اخلاص و یقین، صدق و امانت، صبر تقویٰ، رحم دلی اور جذبہ عفو درگزر کی تعلیم و تربیت سے کرتے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں ایمان اور اخلاق لازم و ملزوم ہیں۔ لہٰذا انبیاء کے مشن میں ایمان اور اخلاق کی تعلیم یکساں اور ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے، اس کا اصل اظہار اعلیٰ اخلاقی اقدار میں ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل احادیث ایمان اور اخلاق کے تعلق کو خوب واضح کرتی ہیں:

((لا ایمان لمن لا امانة ولا دین لمن لا عهد له))(مسند احمد بن حنبل حدیث نمبر 210،154،125)

”جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان بھی نہیں اور جو عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا کوئی دین و ایمان نہیں۔“

((والذی نفسی بیده لا یومن عبد حتی یحب لجاره ما یحب لنفسه)) (مسلم حدیث نمبر 172-171، صحیح بخاری، کتاب الایمان حدیث نمبر 7)

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری زندگی ہے، کوئی بندہ مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے پڑوسی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔“

((لیس المومن الذی یشبع و جاره جائع الی جنبه))(بخاری، الادب المفرد حدیث نمبر 112،

بیہقی، السنن الکبری، ج:10،ص:30)

''وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ رہے۔''

امام بخاری نے اس حدیث کو اس طرح نقل کیا ہے:

((من کان یومن باللّٰہ فلیکرم جارہ)) (صحیح بخاری، کتاب الادب حدیث نمبر 31، مسلم کتاب لایمان حدیث نمبر 76)

''جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کا احترام کرے۔''

((لا یؤمن باللّٰہ من لم یکرم جارہ))

''وہ شخص تو مؤمن نہیں ہوسکتا جو اپنے پڑوسی کی عزت نہ کرتا ہو۔''

((لا یومن باللہ والیوم الآخر من اذا حدث کذب)) (السیوطی، الدرالمنثور، ج:4،ص:131، دارالفکر، بیروت، ت ن)

''وہ شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا نہیں ہوسکتا جو بولتا ہے تو جھوٹ ہی بولتا ہے۔''

((لا یومن العبد حتی یحب لا خیہ ما یحب لنفسہ یا لا یؤمن احدکم حتی یحب لأخیہ ما یحب لنفسہ (بخاری، صحیح بخاری، کتاب الایمان، حدیث نمبر 7، صحیح مسلم، صحیح مسلم، کتاب الایمان حدیث نمبر 71)

''کوئی بندہ خدا بندہ مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

((لا ایمان لمن لاحیاء لہ)) (المنذری، الترغیب والترھیب، ج:3،ص:400، (مطبوعہ مصطفیٰ الحلبی، قاہرہ، ت ن)

''اس شخص کا ایمان معتبر نہیں جس میں شرم و حیا نہیں۔''

ابن جریر الطبری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مجلس میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی مؤمن چوری کا ارتکاب کرسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں کبھی مؤمن سے ایسی غلطی سرزد ہوسکتی ہے۔ انہوں نے پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا کوئی مؤمن زنا کرسکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں، چاہے ابوالدرداء کو کتنا ہی برا کیوں نہ لگے، انہوں نے مزید سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا کوئی مؤمن جھوٹ بھی بول سکتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جھوٹ تو وہی بول سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ پھر فرمایا کہ

بندہ سے لغزش ہو جاتی ہے لیکن پھر وہ اپنے گناہ پر احساس ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرما لیتے ہیں (تہذیب الآ ثار، ج:3،ص:135،حدیث نمبر 223)

یہاں ہم مذکورہ بالا چند احادیث پر اکتفاء کرتے ہیں، یہ احادیث اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایمان وہی معتبر ہے جو اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے ساتھ مزین ہو، اس بات کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک خاتون کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ وہ بہت عبادت گذار ہے، صدقہ بھی خوب کرتی ہے، لیکن اپنی زبان پر اسے کنٹرول نہیں، اس کے پڑوسی اس کی بدزبانی سے تنگ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ خاتون جہنمی ہے۔ ایک دوسری خاتون کا تذکرہ ہوا کہ وہ عبادات وصدقات میں تو کمزور ہے لیکن پڑوسیوں کی راحت و آرام کا خیال رکھتی ہے، ان کے ساتھ حسن کلامی سے پیش آتی ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ عورت جنتی ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل ج:2،ص:440،حدیث نمبر 9673،موسسہ القرطبیہ، القاہرہ

انسان کی زندگی میں صحیح توازن اور اعتدال پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسانی فکر کا قبلہ متعین کر دیا جائے اور انسانی رویوں کو اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ انبیاء علیہم السلام اس منہج تربیت کے مطابق افراد کی ذہنی وفکری اصطلاح اور ان کے ظاہری و باطنی اخلاق کی اصلاح کر کے انسانی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔ اگر افراد اچھے ہوں گے تو ہمارے ادارے، تنظیمیں اور معاشرے بھی اچھے ہوں گے۔ لیکن اگر افراد کی اس نہج پر تربیت کا اہتمام نہ کیا جائے تو ایسے افراد جو فکری بے راہ روی کا شکار ہوں اور ان کے رویوں میں فساد وشر کے جراثیم بھرے ہوئے ہوں تو ایسے افراد کو منظم کر کے جو تنظیمیں بنائی جائیں گی، یا ایسے افراد پر مشتمل جو ادارے قائم کیے جائیں گے ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا، یا ان کے ذریعہ معاشرہ میں عدل واعتدال کے فروغ کی اُمید رکھنا بالکل عبث ہے۔ ایسے ادارے اور تنظیمیں فساد اور برائی کو زیادہ منظم کر کے معاشرہ کو مزید تباہی کی طرف دھکیل دیتی ہیں

رسول اللہ ﷺ نے مکی زندگی میں تیرہ برس تک لوگوں کی فکری، علمی اور اخلاقی تربیت فرمائی۔ جب ایمان قبول کرنے والوں کی واضح اکثریت ایمان ویقین اور اخلاق وکردار کے اعتبار سے اس قدر مضبوط ہو گئی کہ ہر امتحان اور آزمائش کی گھڑی میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ نہ تو کوئی حادثہ وآزمائش ان کے ایمان کو متزلزل کر سکتا ہے نہ ہی اخلاق وکردار کے جس بلند مقام کو وہ حاصل کر چکے ہیں ان میں کوئی ضعف اور کمزوری پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اُمت مسلمہ ہر طرح سے اعتدال کی راہ پر گامزن ہو چکی ہے۔ اس میں وہ توازن اور اعتدال پیدا ہو چکا ہے جو اس دُنیا میں منصب خلافت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے۔ اس پس منظر میں 2ھ میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا، جو اُمت مسلمہ کے لیے اس بات کا اعلان تھا کہ دُنیا بھر کی امامت وقیادت کی ذمہ داری اب ان کے سپرد کی جارہی ہے۔ اسی موقعہ پر یہ آیت بھی نازل ہوئی:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرہ:2:142)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں اُمتِ وسط (معتدل) بنایا تا کہ تم دُنیا بھر کے لوگوں پر (حق کے) گواہ رہو۔''

اس آیتِ مبارکہ میں اُمت مسلمہ کو اُمتِ وسط قرار دیا گیا ہے، وَسط کو اُردو زبان میں توازن اور اعتدال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔یعنی ایسی اُمت جو اپنے تمام معاملات میں متوازن اور معتدل ہو، اس لئے کہ توازن اور اعتدال کے بغیر نہ تو شہادت حق کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے، نہ ہی امامت و خلافت کے عظیم منصب کی ذمہ داریوں کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ دُنیا بھر کے لوگوں کے سامنے حق کی گواہ ہے اور گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عادل ہو، عدل کی صفت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک صدق اور امانت داری کی صفات نہ پائی جاتی ہوں، گویا عدل کا وجود سچائی اور امانت داری کے بغیر ممکن نہیں، لہذا گواہ کے لئے جو شرائط مقرر ہیں اُمتِ مسلمہ کے ہر فرد کو ان شرائط پر پورا اُترنا لازمی ہے۔

ابوالسعود العمادی رحمہ اللہ نے اُمتِ وسط کی تعریف اس طرح کی ہے:

((ای متصفة بالخصال الحمیدة خیارا ، عدولا ، مزکین ، باالعلم و العمل))(1)

''ایسی اُمت جو اخلاقِ حمیدہ سے متصف ہو، خیر کا پیکر ہو، عدل و انصاف کو پوری طرح قائم کرنے والی ہو اور مکمل طور پر علم و عمل سے آراستہ ہو۔''

اس تعریف میں خصالِ حمیدہ کی شرط لگا کر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اُمتِ وسط کا منصب اس وقت حاصل ہوگا جب مجموعی طور پر افرادِ اُمت میں فضائل اخلاق اُجاگر ہو جائیں۔ ''خیارا'' کے لفظ سے قرآنِ حکیم کی درج ذیل آیات کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (آل عمران:3:104)

''تم میں ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں میں بھلائی کے کاموں کی دعوت دے، اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرائی کی روک تھام کرے، یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔''

اسی طرح قرآن حکیم کا یہ فرمان:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ (آل عمران 3:110)

''تم بہترین اُمت ہو، تمہیں دُنیا بھر کے لوگوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا گیا ہے، تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو، منکرات کی روک تھام کرتے ہو اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) تم اللہ پر یقین رکھتے ہو۔''

تیسری شرط اُمت کا عدول ہونا ہے۔ عدول عربی زبان میں ایسے فرد کو کہا جاتا ہے جس میں صفتِ عدل خوب راسخ ہو۔

اعتدال اور توازن کا عدل سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جو معاشرہ عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے وہاں خیر کی قوتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ عدل فرد اور معاشرہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنے میں مددگار رہتا ہے۔ جب کہ ظلم، شر کی قوتوں کو اُبھارتا ہے۔ ظلم تلخ ہوتا ہے اور منفی ردِعمل پیدا کرتا ہے جو معاشرہ میں قائم توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔ ظلم کو ظلم سے نہیں روکا جا سکتا، ظلم کے اثرات کو ختم کرنے کے لئے بھی عدل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

چوتھی شرط مزکین بالعلم والعمل ہے۔ اسلامی معاشرہ کی ابتداء تعلیم و تعلم سے ہوتی ہے۔ انسان کی تعلیم کا آغاز تو تخلیق انسانی کے وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے۔ رسول اللہ ﷺ پر پہلی وحی کا آغاز اقرء سے ہوا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں علم کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پہلی وحی کی پانچ آیات سے حصولِ علم کی اہمیت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے تعلیم و تعلم کا فیصلہ ترجیحی بنیادوں پر طے فرمایا اور ملت کے ہر فرد کے لئے حصول علم کو فرض قرار دیا۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں اصلاح و تطہیر اور اصلاح رویہ کے بارے میں گفتگو کی ہے، فکر اور رویہ کی اصلاح کے ساتھ جب انسان علم کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ علم خود بخود عمل کا قالب اختیار کر لیتا ہے، پھر علم اور عمل میں تضاد باقی نہیں رہتا، اصلاحِ فکر کے نتیجہ میں عقلِ سلیم پیدا ہوتی ہے جو علم نافع کے حصول پر آمادہ کرتی ہے، اور اصلاحِ رویہ کے نتیجہ میں قلبِ سلیم پیدا ہوتا ہے، فکرِ سلیم اور قلبِ سلیم مل کر ایک ایسے مستحکم معاشرہ کو وجود بخشتے ہیں جس میں ہر خیر، ہر خوبی اور ہر جدید صالح کو قبول کرنے کی بھرپور صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی معاشرہ قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اُمتِ وسط کہلاتا ہے، جو ہر قسم کے غلو اور ہر قسم کی تقصیر سے پاک ہوتا ہے اور اسلام کی یہ تعلیمات معاشرہ کو راہِ اعتدال پر گامزن رکھتی ہیں۔

توازن اور اعتدال میں بگاڑ کے اسباب

توازن اور اعتدال کو بگاڑنے والے اسباب بہت سے ہیں، ان تمام اسباب کی روک تھام ضروری ہے۔ ان میں ایک سبب غلو یا انتہاء پسندی ہے۔ انتہاء پسندی کا دائرہ مذہبی امور سے لے کر معاشرتی رسوم و رواج اور سیاسی افکار و نظریات سب کو محیط ہے۔

قرآنِ حکیم نے اہل کتاب کے غلو فی الدین کو رَد کیا ہے اور دینی امور میں غلو کو ممنوع قرار دیا ہے، اہل کتاب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مقامِ رسالت سے بلند کر کے درجہ الوہیت پر فائز کر دیا تھا، انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہہ کر خدائی میں شریک کر دیا۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہے:

﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ. اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ﴾ (النساء:4:171)

''اے اہل کتاب: اپنے دین کے معاملہ میں حد سے نہ بڑھو اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو، مسیح بن مریم تو محض اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ (نشانی) تھے۔''

عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے دعوے کو اس قدر شدت سے پھیلایا کہ دیگر مذاہب کے لوگوں سے نہ صرف تصادم کی صورت اختیار کی بلکہ تثلیث کے من گھڑت عقیدہ کی اشاعت بھی شروع کر دی۔ دوسری طرف ایک پاک دامن اور باکردار خاتون پر زنا کی تہمت لگائی۔ یہ سب دین میں انتہاء پسندی تھی۔ ایک اور آیتِ مبارکہ میں غلو فی الدین سے اس طرح منع کیا گیا ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ (المائدہ:5:77)

''اے محمد ﷺ اہل کتاب سے کہہ دیجئے کہ اپنے دین کے معاملہ میں ناحق غلو نہ کرو اور نہ لوگوں کی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرو کہ جو خود پہلے گمراہ ہوئے اور پھر بہت سے لوگوں کو سیدھے راستہ سے بھٹکایا۔''

یہود و نصاریٰ دونوں کی جانب سے غلو پایا جاتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دے لیتے ہیں اور حرام کردہ چیزوں کو حلال کر لیتے ہیں، اس طرح دین میں تحریف اور افراط و تفریط کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں (2)۔

تعدّی بھی اعتدال کو بگاڑنے کا ایک سبب ہوتا ہے، تعدّی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی قانونی اور اخلاقی حدود کو پامال کر کے دوسرے کو نقصان پہنچائے یا اس کے ساتھ زیادتی کرے عام طور پر اس کی وجہ خود غرضی، حسد، تعصب یا حرص و لالچ ہوتے ہیں، قرآن و سنت کی رُو سے یہ تمام رذائل حرام ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اعتداء یا تعدّی کو ظلم کے مترادف قرار دیا ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (البقرہ:2:229)

''جو شخص اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے تجاوز کر جائے تو ظالموں میں شامل ہے۔''

اس آیتِ مبارکہ کا تعلق عائلی نظام سے متعلق احکام سے ہے، یہ احکام اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر ہیں خاندان کے نظم میں اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود و قیود مقرر کر دی ہیں تاکہ خاندانی نظام کی نہ صرف حفاظت کی جا سکے بلکہ عدل کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جا سکے۔ قرآنِ حکیم نے تو میدانِ جنگ میں بھی دشمن کے ساتھ بھی اعتداء سے منع کیا ہے:

﴿وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (البقرہ:2:229)

''جو لوگ تم سے قتال کرتے ہیں تو تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان سے قتال کرو مگر زیادتی نہ کرنا، اس لئے کہ

اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔"

﴿وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا﴾ (المائدہ:2:5)

"اور ان لوگوں کی دُشمنی جنہوں نے تمہیں مسجدِ حرم جانے سے روک دیا تھا، تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔"

قرآنِ حکیم میں تقریباً (34) چونتیس آیات ہیں جن میں اعتداء کا ذکر ہے، جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کو انتہائی ناپسندیدہ اور گناہ قرار دیا ہے اور اس کی روک تھام کے لئے ہدایات دی ہیں۔

اعتدال اور توازن میں بگاڑ کا ایک اہم سبب ظلم ہے۔ مسلمان مفکرین کے بقول ظلم کا مفہوم یہ ہے ((**وضع الشیئی فی غیر محلہ**))(3) "کسی چیز کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر غیر موزوں مقام پر رکھنا ظلم ہے۔" اس تعریف کے لحاظ سے ظلم کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں وہ تمام اسباب بھی آجاتے ہیں جنہیں ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، یہاں ہم اس کو ایک بڑے سبب کے طور پر الگ سے بیان کر رہے ہیں اور ظلم کی اصطلاح کو اس معروف مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں جس مفہوم میں آج ہمارے معاشرہ میں اسے استعمال کیا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی فرد، جماعت یا علاقہ کے لوگوں کے جان، مال اور علاقوں پر جارحیت کا ارتکاب کرنا۔

ظلم جسمانی تشدد کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے، معاشی استحصال کی صورت میں بھی ہوسکتا، ناجائز سیاسی تسلط اور دباؤ کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے، اعتدال کی قوتوں کو سب سے زیادہ خطرہ اس ظلم سے ہوتا ہے جو ایک ملک کی جانب سے دوسرے ملک کے لوگوں پر کیا جاتا ہے۔ گزشتہ صدی کی ظلم کی بدترین مثال تو وہ ہے جو 1948ء میں اسرائیل کے قیام سے لے کر آج تک تسلسل کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ دُنیا کے مختلف علاقوں کے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے کے لئے فلسطینیوں کے علاقوں پر قبضہ کیا گیا۔ نہتے فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ اُردن اور شام کے علاقوں پر ناجائز قبضہ کیا گیا۔ یہودیوں کی ناجائز بستیوں کے قیام کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہزاروں فلسطینی اب تک شہید ہو چکے ہیں، ہزاروں بے گھر ہو گئے ہیں، ان کے گھروں اور بستیوں پر غاصبوں کا قبضہ ہے۔ مظلوم فلسطینیوں کی کوئی دادرسی نہیں ہوئی۔ فلسطینیوں کے خلاف ظالمانہ کارروائیوں میں صرف اسرائیل تنہا نہیں، اس میں امریکہ سمیت بہت سی طاقتیں شریک ہیں۔

فلسطینیوں کی طرح کشمیری بھی مظلوم ہیں۔ بھارتی حکومت اور فوج نے گذشتہ ساٹھ سالوں میں سینکڑوں کشمیریوں کو شہید کیا۔ اقوامِ متحدہ نے قرارداد کے ذریعہ جو رائے شماری کا حق دیا تھا کشمیری آج تک اُس سے محروم ہیں۔ کون سا ظلم ہے جو بھارتی حکومت اور فوج نے اُن پر نہ ڈھایا ہو حتیٰ کہ انہیں بنیادی انسانی حقوق بھی حاصل نہیں۔ نہتے نوجوانوں، خواتین اور بچوں پر ہر قسم کا تشدد کیا جا رہا ہے۔

سرزمینِ عراق بھی امریکیوں کے ظلم سے محفوظ نہیں رہی، امریکیوں نے یہ بہانہ بنا کر حملہ کیا تھا کہ عراق کے پاس وسیع پیمانے

پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں، لیکن آج تک وہ ہتھیار عراق میں دستیاب نہیں ہو سکے، اگر اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ جس ملک کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہوں تو اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے تو اس پر بہت سے ترقی یافتہ ممالک پورے اتریں گے۔ کیا ان کے خلاف بھی ایسی ہی کارروائی ہونی چاہیے؟ عراقی تو بیچارے امریکی دہشت گردی کا شکار ہو گئے۔ لاکھوں معصوم انسان امریکی بمباری کے نتیجہ میں ہلاک، اپاہج اور معذور ہو گئے، عراقیوں کے تیل اور دیگر وسائل پر ناجائز قبضہ جمالیا گیا۔ آج عراقی بیرونی جارحیت اور ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

افغانستان بھی بیرونی ظلم کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔ افغانیوں کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کسی بیرونی استعمار کی غلامی کو قبول نہیں کرتے۔ افغانستان پہلے روسیوں کی جارحیت کا شکار ہوا۔ افغانی پوری جرأت کے ساتھ سالہا سال روسی استعمار کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اب یہ افغان امریکی اور اس کے اتحادی استعمار کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ طاقت کا توازن افغانیوں کے حق میں بہت کمزور ہے، اس لیے استعمار کو مکمل شکست سے دوچار ہونے میں وقت لگ رہا ہے۔ بہرحال عدل و انصاف کی نظر سے دیکھنے والے افغان یوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ظلم کی ایک اور مثال پاکستان کے شمالی علاقوں میں بیرونی ڈرون حملے ہیں۔ شمالی علاقوں کے بے شمار لوگ بمباری کی وجہ سے ہلاک، زخمی اور اپاہج ہو رہے ہیں، جو لوگ ڈرون حملوں کا شکار ہو رہے ہیں انہیں ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

مجرم: یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے خلاف کوئی جرم عدالتی یا مجاز عدالتی کارروائی کے نتیجہ میں ثابت ہو چکا ہو۔ ہماری معلومات کی حد تک ان حملوں میں کوئی مجرم ہلاک نہیں ہوا۔

ملزم: دوسرا درجہ ملزم کا ہے۔ ملزم وہ ہوتا ہے جس کے خلاف کوئی الزام عائد کیا گیا ہو۔ ایسے فرد کے بارے میں دونوں احتمال ہوتے ہیں وہ معصوم بھی ہو سکتا ہے اور مجرم بھی۔ دُنیا کے کسی قانون میں کسی ملزم کو اس وقت تک سزا نہیں دی جا سکتی جب تک اس کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے۔

معصوم: تیسرے وہ لوگ ہیں جو معصوم کہلاتے ہیں۔ نہ مجرم ہیں نہ ہی ملزم بلکہ عام معصوم شہری ہیں۔

شمالی علاقوں میں میزائل حملوں اور بمباری کے نتیجہ میں پانچ یا چھ فیصد لوگ ایسے ہوں گے جنہیں ملزم کہا جا سکے، باقی پچانوے فیصد معصوم شہری شہید ہو رہے ہیں جن میں بوڑھے، بچے اور خواتین شامل ہیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ اس ظلم کے خلاف کوئی مؤثر آواز نہیں اُٹھائی گئی۔ آخری آزادی کے ان متوالوں کا خون ناحق کب تک بہتا رہے گا! تقریباً پچاس برس قبل ویت نام کے بے گناہ شہری بھی سالہا سال تک امریکی بربریت اور ظلم وستم کا شکار رہے، لیکن جارح استعمال کے خلاف بڑے عزم و ہمت اور دلجمعی کے ساتھ لڑتے رہے۔ بالآخر ظالم قوت کو وہاں سے نکلنا پڑا۔

یہ چند واقعات بطور مثال یہاں بیان کیے گئے ہیں، ورنہ استعماری قوتوں کی داستان ظلم وستم بہت طویل ہے، یہ مقالہ ظلم کی

مزید داستانوں کی تفصیل کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ان مثالوں کو بھی یہاں صرف اس لئے بیان کیا گیا ہے تا کہ اس بات کی وضاحت کی جا سکے کہ بین الاقوامی طور پر لوگوں میں بے چینی، خوف ودہشت پھیلنے کے اسباب کیا ہیں، اعتدال اور توازن میں بگاڑ کیوں پیدا ہو رہا ہے اور پھر نتیجتاً کس قسم کا ردِعمل پیدا ہو رہا ہے۔

قرآنِ حکیم نے ظلم کو حرام قرار دیا ہے لیکن مظلوم کو نہ صرف یہ کہ بدلہ لینے کا حق دیا ہے، بلکہ مظلوم کی دادرسی کو بھی ضروری قرار دیا:

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴾ (الشوریٰ:41:42)

''اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم کیے جانے کے بعد بدلہ لے تو ان پر کوئی الزام نہیں۔''

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ. اُولٰٓئِکَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (الشوریٰ:42:42)

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا﴾ (الاسراء33:17)

''اور جو شخص بطور ظلم قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے وراث کو (قصاص کا) حق دیا ہے، اسے چاہیے کہ قصاص میں زیادتی نہ کرے، بلاشبہ اس کی مدد کی جائے گی''۔

﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا. وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ نِ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ (الحج:40,39:22)

جن لوگوں پر (خواہ مخواہ) جنگ مسلط کی گئی، انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ وہ بھی لڑیں، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا۔ ان کا قصور سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا ربّ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

ان آیات سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مظلوم کو بے یار ومددگار نہ چھوڑا جائے، گویا شرعاً مظلوم کی مدد کرنا فرض ہے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((انصر اخاک ظالماً او مظلوماً))(4) ''اپنے بھائی کی مدد کرو، ظالم ہو یا مظلوم''۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مظلوم کی مدد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، مگر ظالم کی کیسے مدد کی جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دو۔

ہمارے فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ظلم کا خاتمہ ضروری ہے، اور جنگ کا محرک بھی ظلم ہی کا خاتمہ ہے نہ کہ مذہبی مخالفت۔

احناف کی رائے یہ ہے کہ انسان کی زندگی وحیات قابل احترام ہے اسے شرعی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا موقع ملنا چاہیے، جب کہ قتل کی اباحت عارضی ہے جس کی اجازت شر کو دفع کرنے کے لئے دی گئی ہے۔ فقہاء احناف کی رائے ہے کہ محض کفر، کفار کے ساتھ جنگ کا سبب نہیں بلکہ ظلم وشر اس کا سبب ہوتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا خون بہائے یا دوسرے کا۔ ہاں مگر حق کے ساتھ (5)۔

ہماری مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مظلوم کو نہ صرف صدائے احتجاج بلند کرنے کا حق ہے، جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا﴾

(النساء:4:148)

''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کو علانیہ برا بھلا کہا جائے، ہاں مگر جو مظلوم ہے اسے حق ہے، اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

مظلوم کو نہ صرف بدلہ لینے اور جوابی کارروائی کرنے کا حق ہے بلکہ مظلوم کی بھرپور حمایت کرنا بھی تمام انصاف پسند لوگوں کے لئے ضروری ہے۔ انہیں تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ عدل وانصاف کی خاطر تمام منصف مزاج لوگوں اور قوموں کو مظلوم کی حمایت کے لئے اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ عدل کے بغیر اعتدال کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ دُنیا بھر میں اعتدال وتوازن برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام اسباب کا سد باب کیا جائے جن سے نفرتیں اور دُشمنیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک پُراَمن اور پرسکون معاشرہ قائم کرنے کے لئے ہمیں ظلم، عداوت، تعصبات، نفرتوں اور ناانصافیوں کو ہر سطح پر ختم کرنا ہوگا۔

حواشی وتعلیقات

(1) ارشاد العقل السلیم (دار احیاء التراث العربی، بیروت ت ن) ج:1، ص:172

(2) دیکھیے: آل عمران 93:31

(3) یہ تعریف اصمعی نے کی ہے، دیکھیے، ابو منصور محمد بن احمد الازہری، تہذیب اللغہ، دار احیاء التراث العربی ج بیروت 2001-149 ض274

(4) بخاری، الجامع الصحیح، ابواب المظالم، مسلم، الحجاج الصحیح، باب نصر المسلم ظالما و مظلوما

(5) وھبہ زحیلی، بین الاقوامی تعلقات، ترجمہ حکیم اللہ، شریعہ اکیڈمی، 2010، ص:138